

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

جدید مغربی فلسفہ معجزہ و سزا کا نشوونما ایک خاص نظریاتی فریم میں ہوا ہے۔
اس کی بنیادوں میں اولین تصویر یہ کام کر رہا ہے کہ بے خدا مادی کائنات میں انسان کی پیدائش
حیوانات کے خاندان میں چند اتفاقات کی ہم آہنگی سے ہوئی ہے۔ وہ نہ کسی صاحبِ ارادہ و حکمت
خالق کی مخلوق ہے، نہ وہ ایک روحانی و اخلاقی وجود ہے جس پر خلافت کی ذمہ داریاں عاید ہوں،
اور نہ وہ اپنے اعمال و افعال میں کسی بالائے تر قوت کے سامنے جوابدہ ہے۔

جس تصویر تاریخ میں انسان کو رکھ کر دیکھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان پہلے قبل تاریخ کے
دور تاریخی میں تھا۔ اور جنگلی جانوروں کی سی زندگی سے اُس نے اپنے دور کا آغاز کیا۔ پھر بل جل
کر رہنے کی وجہ سے اس میں مدنیت کا جب آغاز ہوا تو اُس نے کچھ ایسی تکلیف دہ اور ناخوشگوار

سہ ہمارا تصویر تاریخ بالکل مختلف ہے۔ دنیا کا پہلا انسان خدائی ہدایت سافٹ لے کر آیا۔ پھر جب
جب یہ ہدایت ضائع ہوئی یا دھندلا گئی یا مسخ ہو گئی تو بعد میں بار بار انبیاء اس کی تجدید کے لیے مبعوث
ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ نبی آخر الزمان تک پہنچا۔ یعنی ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ ”انسانی زندگی“
کا آغاز اخلاقی شعور اور الہی ضابطہ ہدایت یا دوسرے لفظوں میں اسلام کے سافٹ لے ہوا۔ بعد کی ساری
تاریخ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کی تاریخ ہے۔ وحشت اور غلاظت اور تاریکی کا تعلق جاہلیت سے
ہے۔ خواہ یہ جاہلیت کتنی ہی عالمانہ اور عقلی ہو اور جدید ہو۔

چیزوں کو جرم قرار دے لیا جسے مجموعی طور پر کسی مدنی یونٹ کے سارے شرکاء روکنا چاہتے تھے۔ ایسے جرائم کے لیے اپنے نیم مدنی، نیم وحشیانہ دور کے مطابق بہت ہی غیر شائستہ قسم کی سزائیں مقرر کیں۔ جیسی کہ بعض دور افتادہ علاقوں کے تہذیب نا آشنا قبائل میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ اس دور کے سلسلہ مجرم و سزا پر بالعموم مذہب یا دیوتاؤں کا لیبیل لگا دیا گیا۔ اور آبا پرستی کے تحت ان میں ایسا تقدس پیدا کر لیا گیا کہ عقلی طور پر اس معاملے میں غور و فکر سے کام لینے کی کسی میں مجال ہی نہ تھی۔ اب جو روشن دور عقل اہل مغرب کی قیادت میں نمودار ہوا ہے اس نے از سر نو مجرم و سزا کے نظریات کو عقلی طور پر مدون کر کے قانون کو شائستگی کی سطح تک پہنچا دیا ہے۔

جرم کی تشخیص اور سزا کی تعیین میں دورِ جدید کے جمہوری نظام نے شارع کا مرتبہ اصولاً عوام کو اور عملاً نمائندہ ایوانوں کی حکمران اکثریتی پارٹیوں کو دے دیا ہے۔ کوئی جرم، مجرم ہے یا نہیں، ہے تو کس وجہ سے، جس بھی درجے کا ہے اس کے مطابق کیا سزا دی جانی چاہیے، اس کا فیصلہ دائرے عام کے مطابق حکمران پارٹی جمہوری ایوان میں کرتی ہے۔ نئے دور کی یہ شارع قوت جب چاہے کسی مجرم کو کارِ غیر قرار دے، جب چاہے کسی سزا کو ناروا ٹھہرا دے۔

یورپ میں یوں تو ایسی بے شمار تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مگر چند نمایاں مثالیں قابلِ توجہ ہیں۔ زنا بارضاً کو دورِ نو کی عقلیت نے جائز ٹھہرایا۔ اور اب کوئی مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرے تو وہ تو مجرم ہے، لیکن اگر وہ بغیر کسی جبر کے دسیوں عورتوں کی آبرو سے کھیتا رہے تو یہ حلال طیب ہے۔ بلوغت کی مقررہ عمروں سے قبل شادی کرنا قانوناً ممنوع ہے، لیکن شادی کیے بغیر شادی والے تعلقات کا ذوقین اور ذوات میں قائم ہوتے دہنا مباح ہے۔ ایک دروناک مثال یہ ہے کہ عملی قومِ سدوم جو مغرب میں بھی شروع سے ممنوع چلا آئے مگر اب اکثر مہذب ترین ممالک میں جائز تعلق قرار دیا گیا، بلکہ علانیہ ایک ہی جنس کے زوجین باقاعدہ یکجائی ازدواجی زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور شادی کا ڈراما بھی رچاتے ہیں۔ ایسا ہی سزائوں کے معاملے میں ہوا ہے۔ کچھ لیڈروں اور پروپیگنڈے کے اداروں اور انتخاب جیتنے کے لیے سیاسی پارٹیوں نے یہ نقطہ نظر پھیلانا شروع کیا کہ کسی مجرم (خواہ وہ قتل کر چکا ہو) کو سزائے موت دینا ایک وحشیانہ حرکت ہے، لہذا اسے قانوناً ختم ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ برطانیہ امریکہ اور بعض دوسرے ”مہذب“ معاشروں میں سزائے موت ختم کر دی گئی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ اعداد و شمار

کے مطابق قتل اور دوسرے سنگین جرائم میں اضافے کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ چنانچہ ایک بار پھر آواز اٹھ رہی ہے کہ سزائے موت کو بحال کر دینا چاہیے۔ اور نو اور امریکہ کے نئے صدر ریگن صاحب نے بھی سینے میں گولی کھانے اور قبر کے کنارے سے لوٹنے کے بعد بیان دیا ہے کہ سزائے موت ضروری ہے۔

جدید فلسفہ جرم و سزا کا چوتھا عطیہ یہ ہے کہ مجرم کا نشانہ بننے والوں کی مصیبتوں سے قطع نظر کر کے مجرم کے لیے ہمدردی کے جذبات کا رفرما ہو گئے ہیں۔ مغربی فلسفی، مصنفین، مقتنین، سیاسی اکابر اور لیج اور وکلاء سب کے سب اپنے دلائل اور جذبات کا وزن مجرم کے پڑے میں ڈالتے ہیں۔ دورِ جدید کے علم ”مجرمانہ انسانی فعلیات“ (CRIMINAL ANTHROPOLOGY) میں سب سے پہلے نمایاں طور پر ہمدردی مجرم کا عنصر ایک شخص (Lombroso) نے داخل کیا۔

انسان کے حیوانی تصور پر مبنی اس مادہ پرستانہ اور جمہوری تصورِ جرم و سزا کی جڑیں ایسے بیشتر ذہنوں میں اترتی ہوئی ہیں۔ شاید ان کا پورا شعور بھی اُن کو نہ ہو۔ جو متعدد اسلامی ممالک میں قانون کی ڈگریاں حاصل کر کے عدالت و کالت کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہوئے ہیں۔ اور اُن کی پشت پر ماڈرن ازم کے ققیلانِ ناز کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طبقے کے اذان اگر قدرے محبِ اسلام بھی ہوں تو بھی وہ جب جرم و سزا کے مسائل پر سوچتے ہیں تو ”شائستگی“ کے خلاف اسلام تصور کو کسوٹی بنا کر اس پر قرآن و سنت کی سزاؤں کو پرکھتے ہیں۔ اور یو پیسز اس تصورِ شائستگی کے خلاف نظر آئے اُسے دین سے خارج رکھنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے شائستگی پرست اصحاب نے قرآن میں جب چوری کی سزا قطعِ ید دیکھی تو لغت اور محاورے اور سنت اور معمولِ امت سب کو بالائے طاق رکھ کر حکم لگا دیا کہ قطعِ ید سے یہاں مراد چور کے ہاتھوں کو چوری کرنے سے روک دینا ہے۔ آپ نے اُس جیل میں ڈال دیا تو قطعِ ید ہو گیا۔ یا آپ نے توبہ کر کے اس کے معاشی مسئلے کو حل کرنے کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا تو بھی قطعِ ید ہو گیا۔ قرآن کی نہ بان اتنی عامیانه اور سطحی کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ قطعِ ید کہے تو اُس کے معنی کسی آئے سے چور کا ہاتھ کاٹ دینا ہوں۔ پھر قرآن سے ایسی ناشائستگی کی توقع نہیں لگائی جاسکتی۔ اس عنصر کا کہنا یہ ہے کہ

حضور کے جہاں اقوال و افعال قطع یہ کہ سیدھے سادے غیر ٹیپا سراسر مفہوم کی تائید کرتے ہیں وہ حضور جیسے حکیم اور شفیق انسان کے اقوال و افعال ہو ہی نہیں سکتے۔ ایسی چیزیں تو علمی سازش کے تحت گھر گھر کر لوگوں نے دفتر بچ کر دیئے۔ تاریخ اگر ایسی گواہی دیتی ہے تو قرآن کے مقابلے میں تاریخ کی کیا حیثیت ہے جب کہ قرآن اپنے آپ کو واضح کرنے کے لیے کسی خارجی امداد کا محتاج نہیں ہے۔ قرآن میں استعمال شدہ الفاظ "قطع یہ" کے صحیح معنی وہ ہیں جو ہم نے بتائے ہیں اور یہ سبق ہر دور کے لوگوں بلکہ ہر شخص کو پہنچتا ہے کہ وہ قرآنی الفاظ و عبارات کا مفہوم متعین کرے۔ اگر خدا کے رسول نے ان کا کوئی مفہوم متعین کیا بھی تھا تو وہ اسی خاص دور کے لیے تھا۔ ہم سے کیا مطلب؟ اس دور کے لوگ رسول کی تفسیر و تشریح کے محتاج ہوں گے۔ ہم ضرورت مند نہیں ہیں۔ ہم تو اپنی مرضی سے اجتہاد کریں گے۔ یہی چیز سزا کے رجم کو شریعت سے خارج قرار دینے کی بھی محرک بنی۔

دیکھیے ذہنوں کے اندر اترے ہوئے مغربی تصورات جرم و سزا اور معیارات شائستگی معللے کو کہاں سے کہاں لے گئے۔

میں چونکہ اس وقت مسئلے کو عقل عام کی روشنی میں لانا چاہتا ہوں، اس وجہ سے پہلے میں جرم کی شاعت کے چند پہلو واضح کرنا چاہتا ہوں۔

کسی خاتون کی عصمت جب کوٹی جاتی ہے تو اس کے بے شمار اثرات ہوتے ہیں:-

۱۔ ایسا حادثہ اس کی نسائی خودی کا قاتل ہوتا ہے۔ اس کی حیا تباہ ہو جاتی ہے، جو گناہ اور بُرائی روکنے والی مؤثر داخلہ قوت ہے۔

۲۔ اگر وہ کنواری ہو تو اس کا ازدواجی مستقبل تباہ ہو سکتا ہے اور اس کے ماں باپ اور بہن بھائی ذلت کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بہن بھائیوں کے لیے بھی راستے بند ہو جائیں اور ان میں سے جو شادی شدہ ہوں وہ سُسرالی گھرانوں میں بے وقعت ہو جائیں۔ اس کی کسی بہن کو

لے غالباً لعنت اور گراٹر کی قید سے بھی قرآن کو آزاد رکھنا چاہیے۔

اس کا بہنوئی گھر سے نکال بھی سکتا ہے۔ کم سے کم ساری عمر طعنوں کا سلسلہ تو اُسے جبراً اختیار ہوتا ہے گا۔
۳۔ خاندان یا محلے میں ایسے حادثے کا چرچا یا معاشرے میں اُس کا شہرہ خود مظلومہ کے لیے
تکلیف دہ ہونے کے علاوہ کئی دوسرے غیر سلیم الفطرت نوجوانوں میں بدکاری کے مجرمانہ رجحانات
پیدا کر سکتا ہے۔

۴۔ اگر وہ شادی شدہ ہو تو اُس کا شوہر اُسے طلاق بھی دے سکتا ہے۔ اُسے محلّہ بنا کے
بھی رکھ سکتا ہے یا اُسے مستحقاً نشاۃ طعن و تشنیع بنا سکتا ہے۔

۵۔ اگر اُس کے بچے ہوں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی ماں کے ساتھ گزرے ہوئے کسی حادثے کی
وجہ سے وہ بھی بُرائی کے تصورات کی لذت لیتے لیتے خود بھی جرم کی راہ پر پڑ جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں
کے طعنے سنیں یا اپنے ہی اند کے احساس کتری کا شکار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُن میں معاشرے کے
خلاف انتقامی جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ آہستہ آہستہ خرافات مجرم بن جائیں۔

۶۔ مغرب کے جدید غیر اسلامی تصورات کے مطابق جو لوگ نہ ناپا لڑنا کو کچھ مختلف نوعیت دیتے
ہیں وہ اگر سوچیں تو انہیں اندازہ ہو گا کہ اُدھر بیان کردہ بیشتر خرابیوں کا ظہور اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے
بلکہ مخالفتِ ضمیر، خیانتِ شوہر اور بد لحاظیِ اولاد کے پہلو بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

۷۔ مرد کے لیے بھی زنا اُس کے ذہن و ضمیر کو بگاڑنے، اچھے خاندانوں سے حصولِ رشتہ کا دروازہ
بند کرنے، اس کے ازدواجی حالات کو خراب کرنے، والدین اور بہن بھائیوں اور خاندان کے حلقوں
میں اُسے ذلیل بنانے اور معاشرے کے لیے اُسے ذریعہٴ اشاعتِ فحش بنانے کے لحاظ سے بہت بُرے
اثرات بردھ رکھتا ہے۔

۸۔ یہ ایسا جرم ہے کہ اس کے نتیجے میں بسا اوقات خود کشی کے حادثات بھی ہوتے ہیں اور ان
حادثات سے مزید بُرے سماجی اثرات نمودار ہوتے ہیں۔

ایسا فعلِ شنیع جس کے نتائج اگر متعلقہ افراد، خصوصاً عورت کو زیادہ ملتے ہیں، مگر ان کا دائرہ
بہت وسیع ہوتا ہے، اس پر کیا اور کیسی سزا ہونی چاہیے، یہ اس جرم کے متاثرین سے پوچھیے۔ بلکہ میں
ذرا سی گستاخی کر کے یہ کہوں گا کہ غیرت مند لوگ چاہے اس خیال کے ہوں یا اس
طرزِ فکر کے (عدوانہ کرے کہ کسی کو ایسی آزمائش پیش آئے) اگر کسی کی ماں بہن، بیوی یا بیٹی

کے خلاف ایسا کوئی حادثہ ہو جائے تو یہ کسی متعلقہ شخص کو دیوانہ بنا سکتا ہے، اور پھر اگر اس کے جذبات قانون کے فیصلے کا انتظار نہ کریں تو بس چلنے کی صورت میں وہ جو سزا دے گا اس کا اندازہ ہو کر رہ کر سکتا ہے۔ قانونی سزا کے غیر متناسب ہونے کا رد عمل بھی خطرناک شکل اختیار کر سکتا ہے۔

ہمارے معاشرے میں جہاں اس جرم کی مثالیں عام ہیں، وہاں بجاالت اشتعال اس جرم کی خوفناک سزائیں دینے کی مثالیں بھی بکثرت ہیں۔ بجاالت اشتعال کیا۔ بہت سے لوگ تو مدت دراز کے بعد تیار کر کے بدلے لیتے ہیں اور بسا اوقات انتقام در انتقام کا چکر چلتا ہے۔ اور انگریزی قانون جو یہاں اس سلسلے میں رائج رہا ہے۔ وہ اس جرم کی زد میں آنے والی خواتین اور خاندانوں کو اطمینان و اعتماد نہیں دلا سکا اور نہ معاشرے نے کبھی اسے انصاف سمجھا ہے۔ میرے ان جملوں کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ شہر لوہی کو قانون ہاتھ میں لینا چاہیے۔ بلکہ میرا مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والے لوگ عام طور پر اپنے فطری داعیات کے تحت ایسے جرم پر موت کی سزا دیتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی اخبارات میں آتے رہے ہیں کہ انتقام لینے والوں نے محض کسی کو مار دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے اعضا کاٹے ہیں اور بوٹیاں الگ کر دی ہیں۔

ایسی مثالیں ایشیاء اور افریقہ ہی میں نہیں، محض یورپی ممالک میں بھی ملتی ہیں، جہاں انسانی فطرت کو محمدانہ علوم اور پروپیگنڈے کے ذریعے مسخ کر دیا گیا ہے۔ انسانی معاشروں کے ان حالات کو سامنے رکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ رجم ہی اس جرم میں سے کم انتہائی درجے کی معقول سزا ہے جس میں جان لینے کے علاوہ مجرم کو نشانہ بیزاری بھی بنایا جاتا ہے۔ اس سے کم تو سزا دینے سے ایک طرف جرم کو فروغ ہوگا، دوسری طرف جرم کی لپیٹ میں آنے والے فرد اور اس کے اعزہ و اقربا کے شدید رد عمل کی آگ..... مجھ بڑھ سکے گی۔ نیز جرم و سزا میں تناسب نہ ہونے کی وجہ سے متاثرین اور عام معاشرے میں انصاف کا حق ادا ہونے کا احساس نہیں ہوگا۔

لے دورِ حاضر کے لیے بنیاد میں نظر یہ قانون سازی مرتب کیا ہے اس کے (باقی بر صفحہ آئندہ)

آپ یہ سوال اٹھا سکتے ہیں کہ ہماری گفتگو کا زیادہ تر مدنی مجرم مرد کی طرف رہا ہے، مجرم عورت کی طرف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ماں بالعموم اغوا کرنے والا مرد ہوتا ہے اور عورت اس کے جال میں پھنسنی ہے۔ ناموس پر حملہ کرنے والا مرد ہوتا ہے۔ عورت اس طرح حملہ آور نہیں ہوتی۔ پس کثیر صورتوں میں عورت بے گناہ ہو سکتی ہے۔ اور سارا مجرم مرد کے حصے میں جاتا ہے۔ لیکن بالرفا والی صورت میں (جب کہ عورت کو اکراہ یا خوف یا کسی اسکیٹل کے ڈراوے یا قریب یا بیہوشی یا اور کسی پیچیدہ صورت میں مبتلا نہ کیا گیا ہو) عورت بھی برابر کی مجرم ہوگی اور برابر کی سزا پائے گی۔

دوسرا سوال آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آخر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد و عورت کی سزائوں میں فرق کیوں ہے؟

یہاں اختلاف احوال کے لحاظ سے مجرم کو اس کی مجبوری یا کمزوری کا الاؤنس دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مجرم سے جائز طور پر جو سہادی کی جاسکتی ہے یا رعایت برقی جاسکتی ہے، شریعت اُسے ملحوظ رکھتی ہے۔ مثلاً عورت کے متعلق سہ گو نہ مدارج حد یہ ہیں :-

ا۔ شادی شدہ فقیات (غیر آزاد اور غیر خاندانی عورتیں) = ۵۰ کوڑے

ب۔ غیر شادی شدہ مصونات (آزاد خاندانی عورتیں) = ۱۰۰ کوڑے

ج۔ شادی شدہ آزاد خاندانی عورتیں = رجم (سزائے موت بشمول تذیل)

پہلی صورت میں مجرم کو ایک کمزور صورت احسان حاصل ہے، لہذا سزا بالکل کم (نمبر ۱ سے آدھی) دوسری صورت میں چونکہ خاندانی عورت کو خاندان کی وجہ سے خاص معنوی طور پر (باقی بہ صفحہ ۴۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) دوسرے مجرم کرنے والے کو مجرم کے فائدے یا لذت کے ساتھ سزا سے بچ نکلنے کا جو امکان نظر آتا ہے۔ اس کے بالمقابل اگر مجرم کی نوعیت کے مطابق قانون دوسرے پلڑے میں مناسب درجے کی سخت سزا نہ رکھے تو اس صورت میں مجرم بڑھے گا اور مجرم جبری ہوں گے اور ایسے ہی وجوہ ہیں کہ مغرب کا نظریہ مجرم و سزا، جرائم میں کمی کے بجائے اضافے کا باعث بن گیا ہے اور کسی نظام تہذیب کے تحت جرائم کا بڑھنا (دوسرے حالات سے قطع نظر) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نظریہ مجرم و سزا کی ساخت درست نہیں ہے۔